محمد جعفر پھلواری

اسلام اور فطرت

(سلسلہ کے لیے دیکھیے ثقافت مارچ ۱۹۶۳ء)

قانون کی پابندی

لا یکلّف اللہ نفسًا الا وسعھا ۲ : ۲۸۶ - اللہ کسی کو اس کی امکانی وسعت سے زیادہ کا پابند نہیں کرتا۔

پوری کائنات پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے، کیا ہر جگہ یہی فطرت کا اصول کارفرما نہیں ؟ فطرت ہر شے کی بقاء کا سامان اس کے دائرۂ استطاعت کے اندر ہی کرتی ہے۔ انسان کو کچھ کسب کر کے مختلف جھگڑوں کے بعد ہانڈی پکانی پڑتی ہے لیکن چڑیا اپنی بقاء کے لئے صرف اتنا کرتی ہے کہ اُڑ کر کہیں سے دانہ چُگ لیتی ہے کیونکہ وہ ہانڈی نہیں پکا سکتی۔ درخت اُڑ کر دانہ چگنے کے قابل بھی نہیں اس لیے اسے وہیں پاؤں کے نیچے سے غذا مل جاتی ہے۔ جس طرح فطرت نے پتھر کو نمو پر مجبور نہیں کیا۔ اسی طرح درخت کو چلنے کا اور پرندے کو روٹی پکانے کا پابند نہیں کیا۔ اسلامی قانون (شریعت) بھی اسی اصول پر مبنی ہے۔ بچے کو عقل سے کام لینے پر اور مریض کو دوڑ دھوپ پر مجبور نہیں کیا۔ لیس علی الاعمی حرجٌ ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج - نابینا، لنگڑے اور بیمار کے لیے خدا نے وہ تنگی نہیں رکھی جس کا بینا، سالم الاعضاء اور تندرست کو پابند کیا ہے جس کی عقلی اور عملی سطح جہاں تک ہے اسی کے مطابق اور اسی دائرے میں وہ مکلّف بھی ہے۔ آیت میں ایک ایسا کلّی اصول بتایا گیا ہے جو فطرت کائنات کے عین مطابق ہے۔

نیکی و بدی کے نتائج کا قانون

من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا ومن جاء بالسیئۃ فلا یجزیٰ الا مثلھا وھم لا یظلمون ۶ : ۱۶۰ - جو نیکی کرے گا اس کے لئے دس گنا معاوضہ ہے۔ اور جو بدی کرے گا وہ اسی بدی کے برابر بدلہ پائے گا، ان پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔

اس آیت میں جو فطری اصول بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ پھلنے پھولنے کی صلاحیت نیکی ہی میں ہے اور بدی خود اپنے آپ کو ختم کر دیتی ہے۔ ایک اصول فطرت پر نگاہ ڈالئے۔ اگر زمین میں ایک دانہ ڈال دیا جائے اور اس کے ساتھ "نیکی" ہو، حُسن عمل ہو، یعنی زمین، پانی، حفاظت وغیرہ ہوں تو وہ دانہ بڑھ کر کم از کم دس دانے تو ضرور پیدا کرے گا۔ لیکن اگر اس کے ساتھ یہ حُسن عمل نہ ہو تو آپ کے گھر کے اندوختہ دانے ضائع نہیں ہوں گے تنہا وہی دانہ ضائع ہوگا۔ خود قرآن نے اس کی یوں تشریح فرمائی ہے کہ مثل الذین ینفقون فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ ..... ۲ : ۱۶۱ - یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک دانہ سات خوشے پیدا کرے اور ہر خوشے میں سَو سَو دانے ہوں اور اللہ جس کے لئے چاہے اس سے بھی زیادہ اضافہ فرما دے۔ یہاں نیکی کی صرف ایک قسم یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی تمثیل دی گئی ہے اور پہلی آیت میں ہر نیکی کے لئے یہ عام اصول بتایا گیا کہ وہ کم از کم دس گنا پھل لاتی ہے۔ اور ساتھ ہی منفی پہلو بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ ضیاع کی بدی ایک ہی تک محدود رہتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بُرائیاں بھی پھیلتی ہیں لیکن وہ پھیلنا تخریبی ہوتا ہے نہ کہ تعمیری۔ ایک جھونپڑے میں آگ لگا دی جائے تو وہ پھیل کر دوسرے جھونپڑوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی لیکن یہ اضافہ اور پھیلاؤ ہر جھونپڑے کو اپنی جگہ ختم کر دے گا۔ آیت میں جس پھیلاؤ کا ذکر کیا گیا ہے وہ تعمیری اضافہ ہے اور قانون فطرت کے عین مطابق ہے ـــــ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عشر امثال (دس گنے) سے مقصود عددی حصر نہیں بلکہ قانون اضعاف کا اظہار ہے

ظن اور حق کی قوتیں

ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً ۱۰ : ۳۶ - "ظن و تخمین کی حقیقت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں"۔

یہ ایک ایسا اصول فطرت اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کا ایک ذرّہ بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ محض قیاسی اور ظنی باتوں سے کیا دنیا کی کوئی حقیقت بدل سکتی ہے یا بدل سکتی ہے۔ گمان و تخمین سے، اگر وہ صحیح نہ ہو، انسان خود شک میں پڑ جائے گا لیکن حقیقت اپنی جگہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ غلط ظن و قیاس سے انسان کا اپنا نقصان تو ہوگا حقیقت کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ذات باری، قانون مکافاتِ عمل، آئین فطرت، یہ سب حق ہیں اور صحیح حقیقتیں ہیں۔ اگر انسان ان حقیقتوں پر یقین نہیں رکھتا تو ان کا کوئی نقصان نہیں، ہاں اس انسان کا نقصان ہے جو ان حقایق کے متعلق گمان محض سے کام لے رہا ہے۔ سونا سونا ہے سونا ہی رہے گا اور اس کی حقیقت نہیں بدلے گی، نقصان اس کا ہے جو اسے کوئی اور دھات گمان کر رہا ہے۔ آگ آگ ہے اور آگ ہی رہے گی۔ اگر کوئی اس کے متعلق محض ایک سُرخ رنگ ہونے کا گمان کرتا ہے تو اس کی جلا دینے والی حقیقت نہیں بدلے گی۔ اور رنگ سمجھ کر چھونے والے کے ہاتھ جلانے میں کسی رعایت سے کام نہیں لے گی۔ ٹھوس مادّے سے لے کر تصوراتی حقائق تک یہ فطری اصول یکساں کارفرما ہے کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔

قانون ذہاب سیئات

ان الحسنات یذھبن السیئات ۱۱ : ۱۱۴ - "نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں"۔

بہ ظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔ اسی طرح برائیاں بھی نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ اور کائنات میں دونوں اصول جاری و ساری ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بُرائی تمام نیکیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے

کہ اگر برائیوں کا وزن زیادہ ہو تو کم وزن کی نیکیاں دب جائیں گی اور نیکیوں کا وزن زیادہ ہو تو برائیاں دُھل جائیں گی۔ تعداد میں خواہ کوئی بھی زیادہ ہو اس سے بحث نہیں۔ فیصلہ وزن سے ہوگا جو نوعیت سے متعین ہوتا ہے۔ بہرحال زیادہ سے کم کا مغلوب ہو کر دُور ہو جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن آیت میں نیکی و بدی دونوں کو یکساں وزن کے پلڑے میں رکھا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دونوں برابر ہوں تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا۔ اور کون کس کو دُور کرے گا۔ نیکیاں برائیوں کو، یا برائیاں نیکیوں کو؟ یہاں آیت مندرجہ بالا کا فیصلہ یہ ہے کہ نیکیاں ہی برائیوں کو دُور کر دیں گی۔ یہاں گفتگو عند اللہ کی یعنی واقعیت کی ہو رہی ہے نہ کہ عند الناس کی۔ انسان تو کسی کا چھوٹے سے چھوٹا جرم بھی نہیں بخشتا خواہ مجرم میں سَو خوبیاں زیادہ وزن کی موجود ہوں پھر یہ حضرت انسان کسی کی برائی کو اس کی ہموزن نیکی کی خاطر کیوں بخشنے لگے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ عند اللہ یعنی واقعۃ الامر کیا ہے؟ اس آیت کا فیصلہ یہ ہے کہ نیکیاں برائیوں پر غالب آجائینگی۔ بلکہ ان کو ختم کر دیں گی۔ فطرت کا تقاضا یہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے حسنات نور ہیں اور سیئات ظلمت، نور آتے ہی تاریکی کو دُور کر دے گا لیکن تاریکی کسی نور کو دُور نہیں کرتی۔ تاریکی تو نام ہے نور کے مٹ جانے کا۔ سیئات میں بقاء و زندگی نہیں ہے۔ سیئات آپ اپنی موت مرتے ہیں۔ حسنات میں، جیسا کہ ابھی چند سطریں پہلے آپ پڑھ چکے ہیں نمو ہے۔ سیئات اس سے محروم ہیں۔ حسنات سراسر تعمیر ہے اور سیئات ہمہ تن تخریب۔ اگر زمین میں بیس بیس دانے ڈال کر دس کے ساتھ برائی کی جائے اور دس کے ساتھ نیکی، تو دس تو ضائع جائیں گے، لیکن دوسرے دس اپنے فطری نمو کی وجہ سے اس قدر بڑھیں گے اور اُن دس کے ضیاع پر اس طرح غالب آجائیں گے کہ اُن کا ضائع ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جائے گا۔ غالباً یہی وہ حقیقت ہے جسے احادیث میں ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر بندہ نیکی کا ارادہ کرے اور اسے پورا کرے تو اسے کم از کم دس نیکیوں کا اجر ملتا ہے اور اگر نہ پورا کر سکے تو صرف نیک ارادے کی وجہ سے اسے ایک نیکی کا اجر مل جاتا ہے۔ بخلاف برائی کے کہ اگر اس کا ارادہ کرے اور اسے پورا بھی کر دے تو صرف ایک ہی برائی کا بدلہ پائے گا۔ اور اگر پورا نہ کرے تو

محض ارادے کی وجہ سے اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ الغرض ان الحسنات یذھبن السیئات میں ذہاب سیئات کا جو قانون بیان کیا گیا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہے۔

بقائے اصلح وانفع

انزل من السماء ماءً فسالت اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبدا رابیا ط ومما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ ط کذلک یضرب اللہ الحق والباطل ط فاما الزبد فیذھب جفاءً ج واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض ط کذلک یضرب اللہ الامثال ۱۳ : ۱۷ - "اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے تو نالے اپنے اندازے کے مطابق بہنے لگتے ہیں، پھر سیلاب اوپر کے جھاگ اور خس و خاشاک کو بہالے جاتا ہے۔ اور جن دھاتوں کو لوگ آگ میں ڈال کر تپاتے ہیں، زیور یا دیگر سامان تیار کرنے کے لئے ان میں بھی اسی طرح کا جھاگ اور میل کچیل ہوتا ہے۔ اللہ حق اور باطل کی مثال یوں ہی دیتا ہے۔ غرض میل کچیل یا خس و خاشاک تو یوں ہی رائگاں جاتا ہے لیکن جو چیز انسانوں کے لئے نفع بخش ہوتی ہے اسی کو زمین بقاء ہوتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے"۔

ساری آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں بقاء وقیام صرف اسے ہے جو انفع ہے، یعنی اپنے ماحول سے متصادم ہو کر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بے فائدہ اور عبث چیزوں کا دنیا میں کوئی مقام نہیں۔ یہی وہ قرآنی اصول ہے جو کائناتی فطرت کے عین مطابق اور ناقابل ترمیم حقیقت ہے آج کی متمدن دنیا میں یہ مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر عالی شان عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ سائنس اسے بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) اور قرآن اسے بقائے انفع کہتا ہے یعنی (SURVIVAL OF THE MOST USEFUL) اور یہ مادی مصالح ہوں یا روحانی، جسمانی منافع ہوں یا اخلاقی۔ بقاء ہر نوع اصلح وانفع ہی کو ہے، سیاسی زندگی ہو یا اخلاقی، معاشی مسئلہ ہو یا معاشرتی۔ ہر جگہ انسان کو بقائے اصلح وانفع ہی کا فطری اصول برتنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اپنے آپ کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسا کیوں

ہوتا ہے ؟ اس لئے کہ فطرت کا بھی یہی اصول ہے ۔ ہر زیادہ بے کار کم بے کار پر اور کم نفع بیش نفع پر قربان کر دیا جاتا ہے ۔ قدرت بھی ان ہی چیزوں کو باقی رکھتی ہے جن میں نفع کی صلاحیت موجود ہو۔ جب کسی شے کی نافعیت وصالحیت باقی نہیں رہتی تو فطرت بھی اسے باقی رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ ساری کائنات میں آسمانی ستاروں میں اور زمینی مخلوقات میں ہر جگہ یہی قانون فطرت کار فرما ہے اور اسی کا ذکر اس آیت میں بھی کیا گیا ہے ۔ اسی اصول فطرت کو اپنانے کے لئے ارشاد نبوی ہے کہ خیر الناس من ینفع الناس ۔ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے لئے نفع بخش ہو۔

قانونِ ارتقاء

یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون ۳۲:۵ ۔ " وہ آسمان سے لے کر زمین تک کے معاملے کی تدبیر کرتا ہے ۔ پھر وہ اسی کی طرف ارتقاء کرنے کے لئے بڑھتا ہے ایک ایسے دن میں جس کی میعاد تمہاری گنتی کے مطابق ہزار سال ہے۔"

اس آیت کا مطلب دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس پوری کائنات کی ہر شئے خواہ وہ کثیف ہو، یا لطیف ، وجود میں آنے کے بعد منازل ارتقاء کی طرف عروج وصعود کرتی رہی۔ اور ایک منزل سے دوسری منزل میں آنے تک اسے ہزاروں سال لگے ۔ یہ ہزاروں سال کی میعاد ہمارے پیمانۂ وقت کے مطابق ہے ورنہ اللہ ــــ جو زمان ومکان کے انسانی پیمانوں سے بالا تر ہے ــــ کے نزدیک ایک یوم ہے ۔

یہی ہے وہ مسئلہ جسے نظریۂ ارتقاء کہتے ہیں ۔ جو آج حکماء کے نزدیک ایک محقق ومسلم مسئلہ ہے ، ہر چیز کے ساتھ وابستہ ہے ۔ انسان کو لیجئے جو ہر خلق برقی لہریں ہیں ، جنہوں نے ذرّے (ATOM) کی شکل اختیار کی ، پانی اور مٹی کی شکل بدلی ، اور دونوں کے امتزاج سے پہلا جرثومۂ حیات (AMOEBA) پیدا ہوا ۔ اس جرثومے نے ہزاروں شکلیں اختیار کرنے کے بعد انسانی شکل اختیار کی ۔ پھر یہ انسان بھی کئی حیثیتوں سے ارتقاء کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ اس آغاز سے موجودہ انجام تک پہنچنے میں بلکہ ایک درجے (STAGE) سے دوسرے درجے پر

پہنچنے میں ہزارہا سال لگے۔ قرآن پاک میں ان مدارج کی طرف پہنچنے میں بہت سے اشارے موجود ہیں۔

سائنس نے اس سلسلے میں جو کچھ علمی ترقیات کی ہیں ان میں تین نمایاں خامیاں ہیں:۔

(۱) اس نے جو سلسلہ ارتقاء قائم کیا ہے اس میں بہت سی کڑیاں (LINKS) ابھی تک نہیں مل سکی ہیں۔

(۲) اس نے ایک ہی جوئے رواں کے آخری حصے کو انسان قرار دیا ہے حالانکہ زیادہ سے زیادہ صحیح حقیقت یہ ہے کہ منبع تو ایک ہی جوہر حیات ہے لیکن جوئے رواں ایک ہی نہیں بلکہ مختلف ہیں اور ایک ہی منبع سے مختلف چشمے جاری ہوئے ہیں۔ ان میں اعلیٰ ترین چشمہ حیاتِ انسانی کا ہے جس کا آغاز سادہ ترین جرثومۂ حیات سے شروع ہو کر موجودہ صورت بشری تک پہنچا ہے۔ دوسری مخلوقات کا منبع اگرچہ وہی ہے جو انسان کا ہے لیکن وہ ایک الگ چشمے سے تعلق رکھتا ہے۔

(۳) موجودہ درجے تک کے ارتقاء کو تو سائنس نے پالیا ہے لیکن اسے اب تک یہ نہیں معلوم کہ اس ارتقاء کا رخ کدھر ہے اور اس کی منزل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف قرآن پاک کے پاس ہے۔ والیہ یرجع الامر کلہ۔ ۱۱: ۱۲۳۔ والی اللہ ترجع الامور ۲: ۲۱۰۔ والیہ ترجعون ۲: ۲۴۵۔ وانا الیہ راجعون۔ ساری کائنات اپنے اپنے ارتقائی راستے طے کرتی ہوئی اپنے اسی اصل کی طرف جا رہی ہے جہاں سے وہ نکلی ہے۔ غالباً یہی ہے وہ حقیقت جس کی طرف مولانائے رومی نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

ہر کسے کہ دُور ماند از اصل خویش باز جوید روزگار وصلِ خویش

یہ منزل کب آئے گی؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سفر بڑا طویل ہے جسے سمجھانے کے لئے صرف اتنا اشارہ کر دیا گیا ہے کہ تعرج الملٰئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ۔ اوپر کی آیت میں ہزار سال ہے اور یہاں پچاس ہزار سال۔ یہ صرف ایک میعاد و آمد (PERIOD) ہے اور ہمارا پیمانۂ وقت محدود و ناقص۔ بہرحال قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے۔

وہ ایک فطری حقیقت ہے۔

(۴) علم سائنس کی تو نہیں مگر اکثر ماہرین سائنس کی ایک کوتاہی اور بھی ہے کہ وہ اس حرکتِ ارتقائی کو گویا ذاتی مانتے ہیں اور قرآن اس حرکت کا محرک ایک بالائی قوت کو بتاتا ہے۔ ارتقاء ایک فطرت اور ایک نیچر ہے اور اللہ اس فطرت کا فاطر اور اس نیچر کا بخشندہ ہے۔

قانون توبہ

الا الذین تابوا من بعد ذلك واصلحوا فان اللہ غفور رحیم ۵ : ۳۹ "جو لوگ اپنی غلطیوں سے باز آئیں اور اصلاح کرلیں تو اللہ غفور رحیم ہے"۔

انسان جب کوئی غلطی کرتا ہے تو اس کے تین درجے ہوتے ہیں۔ آغاز، وسط، اور انتہاء اگر آغاز ہے تو صرف باز آجانا کافی ہے۔ اگر شروع کرچکا ہے تو باز آجانے کے ساتھ اصلاح یا تلافی بھی ضروری ہے اور اگر انتہائی حد کو عبور کرچکا ہے تو اس کے انتظارِ نتائج کے سوا اور کیا چارہ کار ہے؟ قرآن پاک نے ان تینوں مدارج کا ذکر کیا ہے۔

(۱) انما التوبۃ علی اللہ للذین یعملون السوء بجھالۃ ثم یتوبون من قریب فاولئك یتوب اللہ علیھم۔ ۴ : ۱۷ "یعنی اللہ کے ذمے ہے ان لوگوں کی توبہ کرنا، جو نادانی سے برائی کرتے ہیں۔ پھر احساسِ غلطی ہوتے ہی جلد سے جلد باز آجاتے ہیں۔ بس یہی لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیتا ہے۔

(۲) مندرجہ صدر آیت میں دوسرے درجے کا ذکر ہے

(۳) ولیست التوبۃ للذین یعملون السیئات حتی اذا حضر احدھم الموت قال انی تبت الآن .... ۴ : ۱۱۸ "یعنی قبول توبہ ایسے لوگوں کے لیے ہی نہیں جو برائیوں پر برائیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب موت سر پر آجائے تو کہتے ہیں کہ میری توبہ"۔

تشریح آیات سے پہلے توبہ کے معنی سمجھ لینا ضروری ہے۔ عام طور پر توبہ کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ زبان سے استغفر اللہ استغفر اللہ کی تکرار کی جاتی رہے یا مثلاً اپنی زبان میں یہ رٹتا

رہے کہ یا اللہ میری توبہ، یا اللہ توبہ، توبہ کا یہ مطلب بالکل یہ نہیں۔ توبہ کے معنی ہیں باز آنا، رجوع کرنا لوٹ آنا۔ یعنی جس جگہ سے چلا تھا وہیں لوٹ کر آجائے اور پہلی حالت پر قائم ہو جائے۔ اگر ایک شخص شراب پیتا ہو تو توبہ یہ ہے کہ شراب ترک کر دے۔ اس کی توبہ یہ نہیں کہ ہر گھونٹ پر دس بار استغفر اللہ یا ہر جام کے بعد ایک ہزار بار حساب! غفرلی پڑھ لے۔ توبہ یہ ہے کہ پینے سے پہلے جس حال پر تھا ـــ اور وہ ہے نہ پینا ـــ اسی حالت پر واپس آجائے۔ اسی کو کہتے ہیں باز آجانا، لوٹ آنا، رجوع کرنا، واپس ہونا۔ اور یہی ہے وہ توبہ جس کے مظاہر ہیں کلماتِ توبہ و استغفار۔

اب دیکھئے پہلے اسٹیج یعنی آغازی و ابتدائی حالتِ معصیت کی توبہ صرف اتنی ہے کہ انسان پہلی حالت پر واپس آجائے۔ دوسرے درجے یعنی معصیت کا کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد کی توبہ صرف اسی قدر نہیں کہ انسان باز آجائے، بلکہ اس کے ساتھ ایک مرحلہ اور بھی ہے اور وہ ہے واصلحوا۔ اصلاح و تلافی کر لیں۔ تیسری منزل یہ ہے کہ سرحد عبور کر جائے۔ یعنی پیمانۂ عمر اسی معصیت سے لبریز ہو چکا ہو۔ اس وقت اس کا توبہ کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ توبہ کا تو مقصد ہی ہوتا ہے کہ زندگی از سرِ نو سنور جائے، اور اس کا موقع ختم ہو چکا۔ اب صرف نتیجے کا انتظار باقی رہتا ہے خواہ اس عالم میں ہو، یا عالمِ آخرت میں یا دونوں جگہ۔

قانون توبہ کے ان تینوں مدارج کو دیکھئے پھر موازنہ کیجئے فطرت کے اصول سے۔ آپ دونوں میں ہم آہنگی اور مطابقت ہی پائیں گے۔ گناہ خواہ قانون فطرت سے بغاوت کا ہو، یا قانونِ شریعت کی نافرمانی کا۔ مدارج کا یہی اصول دونوں جگہ کارفرما نظر آئے گا ـــ ایک شخص افیون کی گولی منہ میں رکھ لیتا ہے اس وقت اس کی توبہ یہی ہے کہ احساس ہوتے ہی فوراً (من قریب) تھوک دے۔ دوسرا شخص گولی کو نگل جاتا ہے اور کچھ دیر ہو جاتی ہے لیکن زہر ذراتِ خون میں اس حد تک سرایت نہیں ہو پایا ہے کہ اس کی موت واقع ہو جائے

اس وقت اس کی توبہ یہ ہے کہ کسی طرح قے کر کے گولی باہر نکال ڈالے اور جتنی سمیّت نے اثر کر لیا اسے فوراً کوئی مصلح استعمال کر کے (دوا صلحوا) اپنی طبیعت ٹھیک کر لے تیسرا وہ شخص ہے جو افیون کی پوٹلی گھول کر پی جاتا ہے اور پلنگ پہ جا کر سو جاتا ہے اور اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ اسے پھر جاگنے کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ یعنی اس کا زہر اس نقطے پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں سے موت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے تک تو اسے توبہ یعنی "باز آمدن و اصلاح کردن" کا موقعہ تھا۔ لیکن اب آخری حد پر پہنچنے کے بعد اس کے لئے صرف ظہور نتائج کی منزل باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے ابدی نیند۔

آپ اس قانونِ رجوع و اصلاح اور ظہور نتائج کو پوری زندگی پر پھیلا دیں ــــ انفرادی اجتماعی، مادّی، اخلاقی ہر شعبے پر۔ تو ہر جگہ وہی فطری اصول کارفرما ہو گا جو ان آیات کے اندر قانون توبہ کی ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا قانونِ توبہ عین مطابق فطرت ہے۔

ابتدا کے دونوں اسٹیجوں میں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ ان دونوں توباؤں میں انسان اپنی پہلی حالت پر آجاتا ہے اور اسی لحاظ سے اسے توبہ کہا بھی جاتا ہے۔ اپنی پہلی حالت پر آجانا ہی وہ فضل خداوندی ہے جسے احادیث میں یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ التائب عن ذنبہ کمن لا ذنب لہ۔ "اپنی غلطی سے باز آجانے والا ایسا ہے کہ گویا اس نے غلطی کی ہی نہیں۔ اس کی مثال قانون فطرت کے لحاظ سے یہ دی جا سکتی ہے کہ ایک تنے ہوئے رسّے پر یکے بعد دیگرے اتنا بوجھ لاد دیا جائے کہ وہ ٹوٹنے کے قریب ہو جائے تو ظاہر ہے کہ مزید بوجھ لادتے ہی وہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ ہو گا ظہورِ نتیجہ۔ لیکن اگر رسّے کے نقطۂ انکسار (BREAKING-POINT) پر۔ جو نقطۂ ظہور نتائج ہے پہنچنے سے پہلے وہ بوجھ ہٹا لیا جائے تو وہ رسّہ ایسا ہی رہے گا کہ گویا اس پر بوجھ لادا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ اپنی اصلی حالت پر ہو گا۔ یہی ہے وہ مضمون جو التائب عن ذنبہ کمن لا ذنب لہ میں بیان کیا گیا ہے۔

آخری ظہور نتائج کے فطری اصول کو قرآن پاک نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ ۔۔۔۔

فلم یک ینفعھم ایمانھم لما رأوا بأسنا ۔ ۴۰ : ۸۵ " نافرمانوں کا ایمان لانا اس وقت کچھ بھی مفید نہ ہو سکا، جب وہ ہمارا فیصلہ کن عذاب (ظہور نتائج) دیکھ چکے ۔

قانونِ رحمت

کتب علیٰ نفسہ الرحمۃ ۔ ۶ : ۱۲ " اللہ نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے "۔

ورحمتی وسعت کل شیٔ ۔ ۷ : ۱۵۶ " میری رحمت ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے "۔

بدبخت انسان خدا کو مانے یا نہ مانے، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایک غیر مرئی قوت نظامِ عالم کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور ایک نظر نہ آنے والا فطری قانون کائنات کی ایک ایک چیز کو باقی رکھے ہوئے ہے ۔ سب چیزوں کو چھوڑ کر انسان صرف اپنے وجود پر نظر ڈال کر دیکھے تو اسے اپنے ہی اندر ایک عجیب دنیا نظر آئے گی ۔ وہ کھڑا ہوتا ہے تو اس کے اندر سے ایک فطری توازن اس کے ارادے کے بغیر اس پاؤں سے شروع ہو کر سر تک پھیل جاتا ہے اور وہ توازن اسے ایک لطیف سہارا دیئے رہتا ہے اور اسے گرنے سے بچائے رہتا ہے ۔ یہی توازن چلنے اور دوڑنے میں خود بخود قائم رہتا ہے ۔ دو سیدھی لکڑیاں زمین پر کھڑی کیجئے، تو نہیں کھڑی رہ سکیں گی، گر جائیں گی، لیکن دو ٹانگوں والا حیوان ناطق کس سکون سے کھڑا رہتا ہے، کیسی تیزی سے چلتا اور لپکتا ہے اور کتنی چستی سے دوڑتا ہے اور ایک نادیدہ توازنی قوت اندر سے اسے سہارا دے کر گر پڑنے سے بچائے رکھتی ہے ۔ اس بیلنس کو سنبھالنے والی قوت کا نام سائنسدانوں کے ہاں فطرت ہے اور یقیناً یہ فطرت ہی ہے اور اسی کو آیات مندرجہ بالا میں قانون رحمت کہا گیا ہے ۔ یہاں تک سائنسدانوں کا کہنا غلط نہیں ۔ کسر اگر ہے تو فقط یہ کہ ان نادان سائنسدانوں کو فطرت دکھائی دیتی ہے، فاطر نعوذ دکھائی نہیں دیتا ۔

اور دیکھئے خود انسان کی اپنی دانستہ یا نادانستہ غلطی سے اندر کوئی مرض پیدا ہوتا ہے ۔ اور فطرت کا قانون رحمت وہیں اس کے دفاع کے لئے دفاعی خط پیدا کر دیتا ہے ۔ دونوں

نبرد آزماؤں میں اندر ہی اندر مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر غلطی اتنی بڑی نہیں جو اس کی جان لیوا ہو تو دیر سویر دفاعی قوت آخر کار قوتِ مرض کو تھکا کر ہزیمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مقابلے کا یہی عبوری دور ہے جسے مرض کہتے ہیں۔ چونکہ مرض میں مبتلا جلد باز اور نا صبور انسان اس کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا اس لئے اس عبوری وقفت کا فاصلہ کسی قدر غیر فطری طریقے سے تنگ کرنے کے لیے علاج و دوا کرتا ہے۔ اُدھر اندر سے اخلاط رذیلہ پیدا ہوئے اور اُدھر بخار آیا تاکہ سینک پہنچا پہنچا کر تدریجاً اس مادۂ فاسد کو جلا دے۔ بخار زیادہ تیز ہوا اور ادھر اعتدال حرارت پیدا کرنے کو دست آ گئے۔ غذا ثقیل یا زیادہ مقدار میں ہوئی اور جسم کے اندر کے مائعات یکجا ہو کر شکم میں آ گئے تاکہ فطری عمل اسہال کی شکل میں تمام عفونتوں کو باہر نکال دے۔

اسی طرح انسان قدم قدم پہ ہر آن عظیم الشان خطرات سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور اسی کی ذات سے باہر ہر گرد و پیش میں بھی اور پوری کائنات میں یہی اصول اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ کیا یہ عین رحمت نہیں؟ ضرور ہے اور ہر سائنسدان کو اس کا اقرار بھی ہے۔ لیکن یہ اصول کس طرح قابل فہم ہو سکتا ہے کہ رحمت ہو اور رحیم نہ ہو؟ قرآن پاک اہل سائنس سے ایک قدم آگے بڑھ کر رحمت کے اس فطری اصول کا منبع بھی بتاتا ہے اور یہی حقیقت ہے جو رحمتی وسعت کل شیء اور کتب علی نفسہ الرحمۃ میں بیان کی گئی ہے۔